

ہو کر اندھیرے میں ریگنا شروع کرتا ہے۔ قدم قدم پر خوف، تعجب و شبہات سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ آخر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ آگے بڑھنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہاں سے ”ذوق تحقیق“ واپس لوٹتا ہے اور غلط سلطنت تاریخ کو جمع کر کے نوع انسانی کے آگے لا رکھتا ہے۔ انہیں نتائج کامرعب کن نام ہمارے ہاں فلسفہ ہے۔

حقیقت کی نقاب کشائی میں جو حال دوسرے فلاسفہ کا ہے وہی ہیگل اور مارکس کا ہے۔ دونوں نے جہاں تک تجرباتی علم کا تعلق تھا، جہالت کے پردوں کے پیچھے سے حقیقت کے چہرے کی دھندلی سی جھلک ضرور دیکھی لیکن اس کے خدو خال کے تعین میں جہاں قیاس سے کام لیا وہاں دونوں بھٹک گئے اور اپنے پیچھے ایسے غلط نظریات چھوڑ گئے جنہوں نے نوع انسانی کا رخ ایک غلط منزل کی طرف پھیر دیا۔

ہیگل نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا کہ تاریخ اضداد کے تضادم کا مسلسل نتیجہ ہے مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تاریخ کو ہر پہلو سے ارتقا رہی کرتے ہوئے دیکھا حالانکہ تاریخ کا ایک عمل تکرار بھی ہے۔ مارکس بھی غلط فہمی کی اس کلیہ کو آنکھیں موند کر عبور کر گیا بلکہ اس نے ”غلطی مضمون“ کی شراب کو دوا تشہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ پیش کیا کہ تاریخ کے عمل تضادم کو جاری رکھنے والے محرکات صرف معاشی ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے حقیقت یہ تھی کہ تاریخ کا عمل تضادم مرہون منت ہے ان معاشی اور اخلاقی قوتوں کے اضدادی زوہین“ کا جو انسانی ذہنیت میں فطرت نے پیوست کر رکھے ہیں۔ اگر ہمارے ذہنی عوامل صرف معاشی ہوتے تو کوئی تضادم، کوئی کشمکش اور کوئی ہنگامہ ہاؤ ہو کہ وہ زمین پر پانہ ہوتا۔ یہ نئے نئے نظریے جنم نہ لیتے، یہ تازہ بتاؤ فلسفے رونما نہ ہوتے، یہ نوبہ قوانین وجود نہ پاتے اور ایک نظام زندگی کے پیٹ سے دوسرا نظام تولد نہ ہوتا، ہم لوگ بھی بس ادنیٰ حیوانات کی طرح چرتے پھرتے چل بستے اور یہ تاریخ کے فلسفے مرتب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ آئیے ان دونوں غلط فہمیوں کو صاف کرتے چلیں۔

قانون اعادہ و تکرار | فلسفہ کا کام اگر جزئیات سے گذر کر مہمگیر اصول و حقائق کو دریافت کرنا ہے تو آئیے دیکھیں کہ کائنات ”خط مستقیم“ پر حرکت کرتی ہے یا اس کی فطرت ”دوری حرکت“ کا تقاضا کرتی ہے؟

اصل حقیقت ارتقار ہے یا تکرار؟

ماہ کی اولاد میں شاید سب سے کہتر بہ قامت "سالے کا جزبہ"۔ اس کی زندگی کا مطالعہ کیجیے کہ وہ کیا شہادت فراہم کرتی ہے۔ پھر دوسری طرف ان بڑے بڑے کروں کی تاریخ پر نظر ڈالیے جو خاندانوں کی وجود کے بڑے بڑے رکن ہیں۔ پھر ان خاندانوں کے بڑے بڑے بوڑھوں یعنی آفتابوں کا مشاہدہ کیجیے۔ ہر جگہ "وجود" ایک پیتے کی سی گوش میں مصروف نظر آئے گا۔ اس کے محیط کا ہر حصہ بار بار مخصوص نقاط مکانی کو طے کرے گا جنہیں وہ ایک بار طے کر چکا ہے۔ یہ سارا عمل قانونِ اعادہ و تکرار کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ مادی کارخانہ میں یہ جو تخریب و تعمیر کا ہنگامہ برپا ہے، یہ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، یہ زوال اور کمال کا جو کھیل "مخاض" کھیل رہے ہیں، یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی شہادت فراہم کرتا ہے کہ دنیا میں "انصراف الایات" کا ایک غیر منقطع عمل جاری ہے۔

یہ رات و دن کا چکر، یہ موسموں کی گردش، یہ کیبلنڈر کی تاریخوں اور لمحات و آنات کا اُلٹ پھیر، یہ پودے سے بیج اور بیج سے پودے کی نموداری، یہ گرم اور سرد ہواؤں کے چرخہ کا گھاؤ، یہ انسانی زندگی میں مسرت و علم و صحت و بیماری اور خیر و شر کے مظاہر کا دوران، یہ بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں ماضی استقبال کا بھیس کا "حال" کے اسٹیج پر رونما ہوتا ہے۔

یہی اصول کائنات کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے انسان کی انفرادی زندگی میں کار فرما ہے۔ اس کی نفسی قوتوں کے "تضادی جوڑوں" کے اراکین بار بار عمل کی سطح پر ابھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے احساسات میں بار بار ایک ہی طرح کے نموج رونما ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کھرک پھیرا کرتے ہیں۔ اگر یہ تکرار انسانی زندگی میں نہ ہو تو تجربہ کا سرے سے امکان ہی نہ رہے اور پھر علم، نفس، علم، اخلاق، نہ تو تشکیل پاسکیں اور نہ سرے سے ان کی کوئی ضرورت ہی پاتی رہے۔

خیر تو آگے چلیے۔ انسان کی حیات اجتماعی اور انفرادی زندگی کے درمیان عملاً کوئی لکیر آج تک نہیں کھینچی جاسکی۔

وہ بیک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک اجتماع کا رکن بھی۔ یہ تقسیم صرف نظری ہے۔ فطرت اس تقسیم کو کوئی وزن نہیں دیتی۔ وہ زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے جانتی ہے، لہذا اس کے غیر متبصر قوانین کا سکہ اجتماعی زندگی پر بھی اسی طرح رواں ہے جس طرح انفرادی زندگی پر فرد اور اجتماع کے حتموں کے تین میں جو غلطیاں آج کی جا رہی ہیں وہ کئی کئی مرتبہ کی جا چکی ہیں۔ قانون کی تشکیل میں بے اعتدالی اور اعتدال کے درمیان جو ٹھوکریں صدیوں پہلے کھائی گئی تھیں وہی آج بھی انسانی زندگی کے راستے میں حائل ہیں۔ تہذیب کے اساسی اصول اخراط و تفریط کے درمیان فنگر کی سی حرکت صدیوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن زندگی کے کوٹھو کے گرد پھرنے والے بیل کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہیکل آنکھیں بند کیے ہوئے فتویٰ دیتا ہے کہ ارتقاء ہو رہا ہے، ارتقاء! اور اس بیل کی ڈم پکڑ کر بھاگنے والا مارکس پھولے ہوئے سانس کی رو میں کہتا ہے کہ — ”ہاں یہ ارتقاء ہے اور اس کی وجہ ہے بیل کے معاشی حالات کا تغیر!“

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے | ججے ایک جاپانی ضرب المثل یاد آ رہی ہے کہ :-

”اگر تم بہاڑ کی چوٹی پر بھی چڑھ جاؤ تو تمہیں وہاں بھی انسانی قدموں کے نشان ملیں گے۔“

ضرب المثل یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی چیز نئی نہیں ہے کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی عقلی مقتضیات، وہ باہر ہمد اختلاف زمان و مکان یکساں ہیں۔ ان میں خارجی ہمتیاں کے بدل جانے سے کوئی مینادی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ یہ محبت، یہ شہوت، یہ مجاہد، یہ کبریاؤ کی دامن، یہ جذبہ خدمت، یہ سماج کی پاسداری، یہ ذوق خدا پرستی پر عہد میں برسبر عمل ہیں۔ چاہے ان کے دوا کر اثر کی وسعت میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو۔ بجائے خود ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرہ پر ایک بار عمل میں آسکی ہے وہ آج تک اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے اور نہ معلوم یہ دو ہزار کب تک جاری رہے گا۔

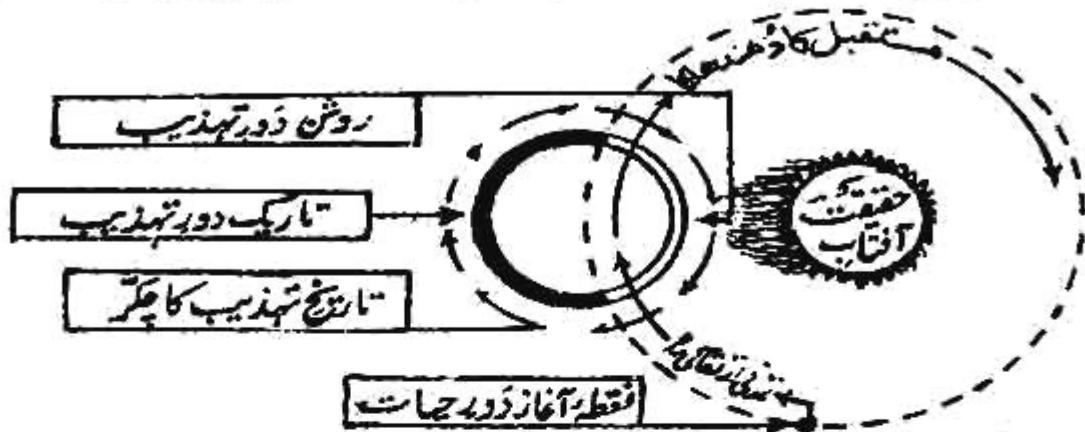
”آزمودہ را آزمودن“ انسانی غلط کاریوں کی کتاب کا ایک بڑا باب ہے۔ جس طرح انفرادی طور پر

ایک دینی غلطی کرتے ہوئے اس غلطی کے معروف انجام سے اپنے آپ کو یہ فریب دے کر آنکھیں بند کر لینا ہے کہ اس کے پچھلے فاعلوں نے ہیشاری سے کام نہیں لیا تھا اور وہ اسے دوہرنا ہے اور اس کے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظام بھی طے کیے ہوئے راستے کو نہ ہادھ پیرے کرتا ہے اور علوم فنون و تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو اور اپنے رفیعوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے "جدید ہے" اور ہماری پیش بندیاں اور امتیاطیں اتنی مستحکم ہیں کہ کسی ایسے نتیجہ بد کا اندیشہ نہیں جو ماضی میں اس راستہ پر چلنے سے برآمد ہوا تھا۔ کل جو چیز غلط تھی اور انسانی فطرت کے موافق نہیں تھی وہ ماحول کے بدل جانے سے صحیح اور مطابق فطرت ہو گئی ہے۔

انسان تو یہ "کالی عینک" آنکھوں پر چڑھا لیتا ہے لیکن فطرت کی آنکھیں حوادث و احوال کو ہمیشہ صاف نظر سے دیکھتی ہیں، اور وہ اپنے فیصلے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ اجتماعی پہلو سے بھی انسانی زندگی قانون تکرار کی جو لاگت کا ہے۔ قانون اور اخلاق کے جزئیات ہوں یا تہذیب کے اساسی اصول، سب ایک گول چکر میں گھوم رہے ہیں اور فلسفہ اطمینان دلاتا ہے کہ ارتقا ہو رہا ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو نہیں بھی دہراتی! لیکن فلسفہ بالکل غلطی پر بھی نہیں ہے۔ فی الواقع تاریخ کا ایک ارتقائی پہلو بھی ہے اور اسی پہلو سے تاریخ کا محدود مطالعہ غلط فہمی کا سبب بنتا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے نفسی قوی ہر عہد میں جوں کے توں رہتے ہیں۔ فرق جو نمودار ہوتا ہے وہ ذہنی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ انسان کی داعی طاقت ایجاد و اختراع کے حربوں سے خارجی دینا کو بدلتی جاتی ہے۔ اس طرح خود نفسی قوت کے لیے نوبو خارجی محرکات فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس عمل و فعال سے انسان کی شخصیت کو نمودار ہونے کے لیے بہتر سے بہتر پیرائے حاصل ہوتے جاتے ہیں اور اس کا دائرہ عمل وسیع تر ہونا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی قوتوں کے اصول کار کا تعلق ہے، وہ جوں کے توں رہتے ہیں چنانچہ ان قوتوں کے اجتماعی عمل سے جو نظام ہائے حیات رونما ہوتے چلے آ رہے ہیں وہ مظاہر تمدن اور اسباب قوت کی حد تک تو ارتقا کر رہے ہیں لیکن اصول تہذیب اور اصول قانون و اخلاق کے نقطہ نظر سے ان پر قانون اعادہ و تکرار ہی کا سکہ

رواں ہے۔ ہر غلط اصول اور ہر صحیح نظریہ بار بار ابھرتا ہے۔ لیکن ہر بار اس کا چولہہ بدلا ہوا ہوتا ہے اور ہر بار وہ نئے ہتھیاروں سے مسلح اور جلوہ میں قوت کے نئے قشونِ قاہرہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ ہے ارتقا اور تکرار کے اضدادی جوڑے کے باہمی کارنامہ کی حقیقت۔ اس حقیقت کی وضاحت شاید ذیل کی شکل سے خوب ہو سکے گی:-



”خَوْبُ اللَّيْلِ فِي النَّهَارِ“ اور ”ذَوْبُ النَّهَارِ فِي اللَّيْلِ“ کا تماشا مٹی کے کروں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی تاریخ میں بھی دکھایا جا رہا ہے جب کبھی مابعد الطبعی حقائق کا آفتاب براہ راست انسانی سوسائٹی پر چمکنے لگتا ہے اور درمیانی حالات ہٹ جاتے ہیں تو اعتدالی اصول تہذیب غالب ہونے لگتے ہیں، ایک معتدل قانونِ حیات ان اصولوں کے گہوارے میں پرورش پانے لگتا ہے اور روشن دور تہذیب کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ یہ صبح آہستہ آہستہ دوپہر کے اوج کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی کے اندر ہی اس کے قائم کردہ نظامِ زندگی کو تباہ کرنے والے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جو اس کے غلبہ کے وقت اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح کسی دوا کی چند تیز خوراکیوں سے بعض مریض کے حملہ تیز دب جاتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں نظامِ رواں میں ذرا کمزوری نمودار ہوئی یہ عناصر سرے پر آ جاتے ہیں اور پھلنا پھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ تا آنکہ کچھ نئے اصول تہذیب جو دراصل نئے نہیں ہوتے، فلسفہ و حکمت اور ادب و صحافت کے سانچوں میں ڈھل کر پھینے لگتے ہیں۔ پھر ایک فراطی یا تفریطی نظامِ حیات خود اعتدالی نظامِ حیات ہی کے پریٹ سے رفتہ رفتہ برآمد ہونے لگتا ہے اور کچھ مدت میں بیاسی سکون حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تاریخ تہذیب کی رات ہوتی ہے اور اسے فلسفیانہ اصطلاح میں ”تاریک دور تہذیب“ کہا جاسکتا ہے۔ پھر اس دور تہذیب کے مخالف عناصر جو دب گئے تھے

رفتہ رفتہ سر نکالتے گتے ہیں اور انقلابی مساعی کے اسلمہ سے مسخ ہو کر اس کے خلاف زور لگاتے ہیں۔ انرض
انسانی تاریخ بار بار تاریک اور روشن دوروں کو عبور کرتی ہوئی تمدنی ارتقار کے راستہ پر بڑھی چلی جاتی ہے،
جس کا آغاز انسانی پیدائش سے ہوا تھا اور خاتمہ انسانی زندگی کی انتہا پر ہو گا۔

غاروں سے محلات تک پتھر کے اوزاروں سے دھات کے آلات تک، چراغ سے بجلی تک، گدھوں
اور ٹٹوں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برنگی سے دیا حریر کے البستہ تک، اشاراتی گفتگو
سے شاعری اور کہاں خطابت تک، تصویریں نقوش سے پریس تک جو ایجادات عقل انسانی نے کی ہیں ان
سب کے متضاد اصولوں کے علمبرداروں نے یکساں کام لیا ہے۔ دونوں قسم کی تہذیبوں کے ذرائع و وسائل کار
اور اسباب قوت میں یکساں اضافہ ہوا ہے، لیکن ان کی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ غاروں میں بسنے والے ننگ
دھڑنگ انسان نے بھی اس کشمکش میں حصہ لیا ہے اور آج کا انسان بھی فریقین جنگ میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دے
رہا ہے۔ میل گاڑیاں ہانکنے والے ابن آدم کے حالات بھی دراصل ایک محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے
جیسے وسیع پیمانے پر موٹر چلانے والے خاکی پتے کے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس عہد کا مطالعہ کرتے ہوئے ناقد
کی نگاہ براہ راست انسان پر جا ٹھہرتی ہے کیونکہ وہاں دیکھنے کی چیز ہے ہی صرف انسان، لیکن آج پہلی نظر
مشینوں، گاڑیوں، ہوائی جہازوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور بجلی گھروں کے طلسمات ہوش ربا میں الجھ کر رہ جاتی
ہے اور تمدن کی چمک مک انہی فرصت ہی نہیں دیتی کہ انسان کے ذہنی پیمانے کے گھماؤ کو دیکھا جائے۔ یہ اوپر کا
ارتقار نیچے کے عمل تکرار کو چھپاتا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ اسباب جیات و وسائل کار میں کتنا اضافہ ہوا۔
اصل سوال یہ ہے کہ انسان نے زندگی کی تشکیل کن اصولوں پر کر رکھی ہے۔ سو اس نقطہ نظر سے غور کرنے والا دماغ
بہر حال اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آدمی افراط و تفریط اور اعتدال کے نقاب سے گمانہ کے ڈھترے پر گھوم رہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابق) سہ "تاریک دور تہذیب" بخلاف "روشن دور تہذیب" کے اندرونی طور پر سماجی اور سیاسی انقلاب کی جولا
بنارہتا ہے۔ اس میں "فصادم درنقادم" کے عمل سے نئے نئے سماجی اور سیاسی نظام فروغ پاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ "راہ اعتدال"
کو چھوڑنے کے بعد انسان پر بے اعتدالی کی سینکڑوں راہیں کھل جاتی ہیں۔

بطور مثال کسی ایک اصول تہذیب کو لے لیجئے۔ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اب آئیے اور عرب (قبل از اسلام) کی سوسائٹی کو سامنے رکھیے۔ اس میں شک نہیں کہ جاہلیت کا عرب حکومت کا کوئی واضح اور منضبط نظام نہیں رکھتا تھا لیکن یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نظم اجتماعی کسی شکل میں تھا ہی نہیں اور اسے جاری رکھنے کی کوئی قوت سرے سے موجود نہ تھی۔ نظم اجتماعی یقیناً تھا اور اس کی اساس سنخ شدہ مذہبی مراسم و عبادات، عام اخلاقی ضوابط، آبائی رسم و رواج اور قبائلی مفاہمتوں وغیرہ پر قائم تھی۔ اس نظام نے "انفرادی آزادی" کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ یعنی اجتماعی بہنیت فرد کے سامنے باطل ہے بس اور بے وزن تھی۔ تاریخ میں یہ دور آیا اور گزر گیا۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پھر کبھی نہ آئے گا۔ لیکن یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ آج پھر وہی دور عین ہماری آنکھوں کے سامنے کار فرما ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کی بنیادی اصول ہی انفرادی آزادی کی حدود کو پھیلانا ہے اور اس اصول سے وہ تمام نتائج برآمد ہو رہے ہیں جو جاہلیت کے عرب میں نمودار ہوئے تھے۔ یعنی سرمایہ داری، عیاشی، فحاشی وغیرہ۔ اب قانون فطرت کے مطابق روس میں اس اصول کا رد عمل رونما ہوا ہے اور فرد کی شخصیت کو ختم کر کے پوری اہمیت سوسائٹی کو دیدی گئی ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جو نقطہ عدل ہے وہ اگر ابھی نگاہوں سے پنہاں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ پنہاں رہے گا۔ نہیں! شاید حالیہ جنگ کے بعد کوئی گروہ اس نقطہ عدل کا داعی بن کر اٹھے اور تہذیب کا رُخ پلٹ دے۔

تعماشی انتفاع کی بیماری کو لیجئے۔ یہ روگ قبیلوی دور سے لے کر بین الاقوامی دور تک انسان کی جان کا یکساں لاگورہا ہے! افراد افراد سے، قبیلے قبیلوں سے، طبقات طبقات سے اور قومیں قوموں سے بار بار زندہ ہوا انتفاع کرتی رہی ہیں۔ یہ انتفاع کبھی تو مذہب کے مقدس چہرے کو بدنام کرتا ہے، کبھی جاگیر داری کا بہرہ بھرتا ہے،

نہ دوسرے انقلاب موجودہ تاریک دور تہذیب کا ایک اندرونی (سماجی) انقلاب ہے۔ وہ موجودہ تہذیب کے اصولوں کو یکسر نہیں بدل دیتا بلکہ سماجی تغیرات کے لیے ان میں جزوی رد و بدل کرتا ہے۔

کبھی نیکوں اور کارخانہ داریوں کے جال پھیلانا ہے اور کبھی سیاسی جہاں گیری اختیار کرتا ہے۔ بیماری ایک ہی ہے لیکن اس کے پیرایہ ہائے ظہور جدا گانہ ہیں۔

مزید مثال کے طور پر انسان کے صنفی رابطہ کو لیجیے۔ دور وحشت میں یہ تعلق بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں تحریک ہوئی صنفِ مقابل کے کسی فرد سے استفادہ کر لیا۔ لیکن اس دور سے آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ اب انسان اس منزل کو عبور کر کے پھر اسی صنفی انارکزم کی طرف لوٹ رہا ہے اور یہ اصول پھل رہا ہے کہ شوہر سبکدوش ہو اور بیوی سب کی بیوی ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھیے تو عورت کی حیثیت کا مسئلہ ہے۔ بچاری شرفِ انسانیت اور "مظلومیت" کی منزلوں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہتی ہے، کہیں یہ "لوٹری" کے درجہ میں نظر آتی ہے، کہیں اسے شرفِ آدمیت حاصل ہو جاتا ہے اور کہیں دوبارہ شرفِ انسانیت سے معزول ہو کر "موس کا کھلونا" بن جاتی ہے۔

آگے چلیے "مشورہ" اور "جمہوریت" کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیے۔ یہ عبرتِ عظمیٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے حالانکہ عرب، یونان، اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جائیے اور زمانہ قبل از تاریخ میں اس کا سراغ لگائیے تو وہاں بھی جمہوریت اور شوریٰ کے تخائف موجود دیتے ہیں۔

بالکل یہی کیفیت جزیرہ یاقا نوئی کی ہے۔ قانون کی عالمگیر تاریخ سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرام بارہا حلال اور حلال بارہا حرام ہوا ہے۔ نہ صرف قانون بلکہ اخلاقی جزئیات کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی روابط کی ایک ایک شکل پر کتنی ہی مرتبہ خوش اخلاقی کا ایبل لگایا گیا ہے اور کتنی ہی مرتبہ بد اخلاقی کی ہر شرت ہوئی ہے۔

سہ ہفتہ کیبت اس بیماری کا علاج تو کرتی ہے لیکن علاج ایسا تجویز کرتی ہے جو خود بعض دوسری بیماریوں کا موجب ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح نظامِ جاگیرداری انسانی سوسائٹی ہی کے فائدے کے لیے وجود میں آیا تھا اور جسمِ انسانیت کو بعض بیماریوں سے بچاتا ہی اس کا مقصد تھا لیکن اس سے بعض غیر متوقع نتائج رونما ہوئے۔ وقتی بیماریات کی زد میں بہتا ہوا انسان جب تک رخصت نہ کرتا ہے تو فتنہ کا ایک دروازہ بند کرنے کے دوران میں کتنے دردناک کھول دیتا ہے تا آنکہ ایک نیا رخ تجربہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ جائے

خیر اس مضمون میں جزئیات کی تفصیلی بحث کا تو موقع نہیں یہاں تو اصول تہذیب کا تصادم پر نظر ہے لیکن اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے خود اصول تہذیب کی مابین کا جاننا ضروری ہے۔ یہ اصول تہذیب کیا ہے؟
اصول تہذیب | انسان کی طبعی زندگی میں مابعد الطبعی ضروریات کا جو جوڑ لگا ہوا ہے یہ عجیب پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس اجتماعِ ضدین کو دیکھ کر عقل کا سر ہلکانے لگتا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ سارا کھیل ہی اضدادی زوجین کے عمل و تعامل سے چل رہا ہے۔

آدمی اگر جانوروں کا سادماغ لے کر پیدا ہوتا تو بات آسان تھی کہ کھایا، پیا اور چل بے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں بات میں سے بات نکلتی ہے، سوچنا فطرت ہے، اسباب و نتائج کو ڈھونڈنا حجت میں داخل ہے، حقائق کا کھوج دگانا مخلصیت کیونکہ سو سائٹی میں رہنا ہے اور آدمیوں کی طرح رہنا ہے۔ بچا را کادل مارکس کا معاشی حیوان "انسان بھی واقع ہوا ہے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ زندگی کیا ہے؟ کائنات کا ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ چرنے پگنے پر یہ اکتفا نہیں کرتا۔

یہ سوال جو انسان کے دل میں غیر واضح طور پر مابعد الطبعی امور کے متعلق پیدا ہوتے ہیں انہی کے جواب میں جو نظریات انسان قبول کر لیتا ہے وہی اصول تہذیب کہلاتے ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر خاص طرز کے سماجی نظام اور سیاسی ہیئتیں قائم ہوتی ہیں اور ان اصولوں میں ادنیٰ سا تغیر کر دینے سے سماجی نظام اور سیاسی ہیئت میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ اصول تہذیب کی طرف رہنمائی کرنے والے سوالات یہ ہیں :-

- ۱۔ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے؟
- ۲۔ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟
- ۳۔ زندگی اسی زمین تک محدود ہے یا یہ رشی دراز ہے؟
- ۴۔ آدمی اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے سامنے جواب دہ ہے یا نہیں؟
- ۵۔ معیار خیر و شر کیا ہے؟

۶۔ قانون کا سرچشمہ کہاں ہے اور انسان کے لیے قانون بنانے کا حق کیسے ہے ؟

۷۔ عقل انسانی کا میدان کار کہاں تک وسیع ہے ؟

۸۔ فرد اور سوسائٹی کے مابین کی حقیقت کیا ہے ؟

دیگرہ

ان سوالات کے جوابات ایک تو وہ ہیں جو فلسفہ اور شاعری کی تباہ کن ادھوات کتابوں میں ملتے ہیں اور ایک وہ جو اہامی ذخائر علم میں پیش کیے گئے ہیں اور سر پہلو سے ہم آہنگ ہیں۔ مورخ الذکر اصول تہذیب بار بار دشمن ادوار تہذیب کی روح بنے ہیں اور ان کے خلاف ظنی نظریات کا جو بنا رہے اس سے قسم قسم کے تاریک ادوار تہذیب کی نمود ہوتی رہی ہے۔ یہ دو مختلف النوعیت اصول تہذیب آپس میں متصادم ہیں۔ انسان کی نوعی ذہنیت ان کی پیکار گاہ ہے اور انسانوں کے مختلف گروہ ان کے آئے کا رہتے ہیں اور تضادم در تضادم کا عمل جاری رہتا ہے۔

ایک نوعیت کے اصول تہذیب جب لٹریچر، نظام تعلیم اور صحافت کے کارخانوں میں نمود کر کے ایک ذہنی نظام قائم کر لیتے ہیں تو لوگوں کے زاویہ ہائے نظر بدل جاتے ہیں، مجباً انتخاب بدل جاتا ہے، سیاسی مذاق بدل جاتا ہے اور ہر طرف ایک ایسے نظام حیات کی پیمائش پھیل جاتی ہے جو جدید اشیاء اصول تہذیب سے کلی مناسبت رکھتا ہو۔ نئی مضامین پرانے نظام کا دم گھٹنے لگتا ہے اور آخر کار محض مشق تیار کی ہوئی عمارت و طرام سے بھر پڑتی ہے۔

آدمی صاحب راہ و انتخاب ہونے کے باوجود ان تضاد اصولوں کے ہاتھوں میں کھٹ پھیل جاتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول خود کھٹ پھیلیاں ہیں اور جن ناروں پر یہ حرکت کرتی ہیں ان کا سرچشمہ دھندلا دھندلا نظر آ رہا ہے۔ آئیے ذرا قریب چل کر دیکھیں کہ اس سرچشمہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

۱۰۔ یہ سوالات چاہے بظاہر کتنے ہی غیر محسوس کیوں نہ ہوں ہر آدمی ان کے جواب میں فیض یا اثبات کوئی نہ کوئی حکم ضرور نکالتا ہے۔

ذہن انسانی کا مطالعہ | دریا پہاڑ، ہوائیں، چاند، سورج، ستارے یہ سب کے سب غیر متغیر اصولوں کے مدار پر سرپٹ دوڑتے ہیں۔ انھیں کسی رسہ کشی میں حصہ نہیں لینا پڑتا۔ کتنی پرسکون اور پر امن زندگی ہے۔ انسان کائنات کے انھیں قرار کے پہلو پہلو زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وہ کون سا فرق ہے جو اسے تضاد و در تضاد کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ یہ ساری مصیبت اختیار و شعور کی ہے۔

دل لکے ہم تو فتنہ در آغوش ہو گئے

اور اختیار و شعور کا سرچشمہ ذہن انسانی ہے۔ یہی ہے اصل مطالعہ کی چیز۔

ادھر لانا اور ادھر لانا

پکڑ لیں چور دل کا ہم یہیں سے

ذہن انسانی گونا گوں متضاد قوتوں کا منبع ہے۔ ان متضاد قوتوں کو اگر دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ذہن کے اندرونی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ایک لشکر تو مارکس کے معاشی حیوان کا ہے اور دوسرا اس مظلوم غیر معاشی انسان کا جسے دنیا کے اس مشہور فلسفی نے نظر انداز کر دیا۔ معاشی حیوان محض خواہشات لکھتا ہے۔ اور عقل کی مدد سے انھیں پورا کر لینے کو مہلتا ہے مقصود قرار دیتا ہے لیکن غیر معاشی انسان اجتماعی نظم کے تحفظ کے لیے معاشی حیوان کو بعض حدود میں محدود رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ایک لگ مسئلہ ہے کہ انسان محض تجربی عقل کی بنیاد پر صحیح ضابطہ حیات مرتب کر سکتا ہے یا نہیں اور انسان کے ضابطہ حیات کا مصنف کون ہو سکتا ہے۔ تاہم ضابطہ کی پیاس جو ہر فرد کو محسوس ہوتی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ یہ نہ ہونو اجتماعی نظم کی تشکیل ہو ہی نہ سکتی۔ خیر تو یہ معاشی حیوان اور غیر معاشی انسان اندہ ہی اندر اپنا اکھاڑا گرم رکھتے ہیں جب غار جی محرکات کے بل پر خواہشات زور کرتی ہیں تو وہ اخلاقی حس کو دبا لیتی ہیں اور جب خدائی حس میں بیرونی عوامل کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے تو وہ خواہشات کو چپت کر دیتی ہیں۔ یہ بد عہدیاں، یہ چوری چکاری، یہ فریبے ہی، یہ رقص و زنا وغیرہ کے شیطا طین غیر عقل خواہشات کی موجوں پر ہی بہہ کر آتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایثار، خدمت، فدا

کاری، احترام حقوق، اور حدود کی پاسداری کے فرشتے اخلاقی جس کے مطلع سے طلوع ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہر عہد میں ہیں وہ انسان ملتا ہے جو انفرادیت کی شراب سے مست ہو کر محض اپنے مفاد کے لیے انسانیت کو زخم لگاتا ہے۔ اور دوسری طرف ہیں ہر عہد میں وہ انسان بھی نظر آتا ہے جو انسانیت کی خاطر پے درپے چڑھیں کھاتا ہے۔ یہ دونوں کردار اس عملی قصاص کے نتائج ہیں جو دو متضاد رجحانات میں جاری ہے۔ برداظمی و خارجی تاثر ارادہ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کشمکش کی بھٹی سے ہو کر گذرنا ہے۔

ان متضاد اندرونی رجحانات کے "نقاط مصالحت" بے شمار ہو سکتے ہیں جو مذہب اور تجربی عقل کی مدد سے ایک فرد کے شعور کے سامنے بکھرے رہتے ہیں۔ ان نقاط میں سے ایک تو نقطہ عدل ہوتا ہے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر افراطی اور تفریطی نقاط متعدد ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ماحول کے تغیرات ان میں سے بعض کو ابھار دیتے ہیں اور بعض کو شعور کی نگاہوں سے ذرا دور ہٹا دیتے ہیں۔ اس طرح مختلف سوسائٹیوں میں مختلف فطری مطاببات کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فطری مطاببات کو پورا کرنے کا ہر طریقہ صحیح اور مفید ہی ہے مثلاً ایک شخص کے اندر صنفی ہیجان رونما ہوتا ہے۔ اب اس آگ کو بجھانے کے متعدد طریقے اس کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ وہ نکاح یعنی صنفی عہد نامہ کا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ زنا بالجبر کی راہ پر بھی پڑ سکتا ہے لیکن یہ صنفی مقابل کے حق آزادی میں ناجائز مداخلت ہے۔ وہ ایک بیسوا کے آستانے پر بھی سر جھکا سکتا ہے لیکن اس طریقہ سے صنفی خواہش کا اصل مقصود یعنی تناسل قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ عام صنفی اتار کزیم کی سرک بھی اس کے سامنے کھلی ہے لیکن اس سے "خاندان" کا وہ مرکزی ادارہ خطرے میں گھر جاتا ہے جو اجتماعی تنظیم کے پھٹے کا ڈھرا ہے۔ وہ راہب بھی بن سکتا ہے اور خصی بھی ہو سکتا ہے لیکن مصاف زندگی سے یہ گریز فطرت انسانی کو ناگوار ہے۔ یہ سارے نقاط ایسے ہیں جن پر انسان کے متضاد ذہنی رجحانات کی مصالحت ممکن ہے اور ان میں سے ہر نقطہ پر مصالحت ہوتی رہتی ہے۔ انسان کا عملی اور علمی ماحول اسے کبھی کسی نقطہ کی طرف

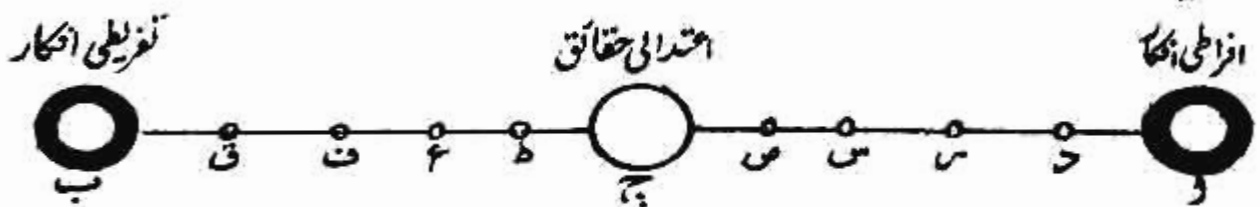
ڈھکیل دیتا ہو اور کبھی کسی کی طرف۔ بایں ہمہ نقطہ عدل ایک ہی ہے اور انسانیت ہمیشہ اسی کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ نوع انسانی نقطہ عدل یا کسی دوسرے نقطہ پر متحد نہیں ہو جاتی؟ فطرت کی یکسانی کے باوجود ذہنی اختلافات کیوں رونما ہوتے ہیں؟ کیوں نہیں آیا ہوتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے معاشی اور اخلاقی رجحانات کسی ایک نقطہ مصالحت پر متفق ہو جائیں اور ایک متقل توازن قائم ہو جائے؟ دراصل ذہن ہے ہی حوادث کی جولا نگہ جس میں بگاڑ اور بناؤ کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کی سہواری اور یکسانی کا مطالبہ بے جا ہے۔ ذہن انسانی کی تشکیل میں تین بڑے عوامل حصہ لیتے ہیں:-

۱۔ وراثتی اثرات - ب۔ تربیت ج۔ ماحول۔

یہ تینوں عوامل ایک انسان کے تمام ذہنی رجحانات اور قومی کو متحرک کرتے اور اپنے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل کوئی سے دو افراد کو بھی یکساں میسر نہیں آتے۔ ان کے تنوع کے زیر اثر انسانی مذاق، نقطہ نظر اور مقاصد میں بھی تنوع رونما ہو جاتا ہے۔ یہی عوامل کسی کو محض معاشی حیوان بنا کر رہتے ہیں کسی کو اعلیٰ انسانی مقاصد کے عشق میں ایسا مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے پیٹ کو بالکل بھول جاتا ہے، کہیں روٹی پر قوم و ملت کو بیچ دینے والے جعفر و صادق نمودار ہوتے ہیں اور کہیں قوم و ملت یا انسانیت کے لیے فاقہ کشی کرنے والے دیوانوں کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی ذہنی تنوع ایک سوسائٹی میں مختلف اخلاقی و قانونی تبدیلیوں کی بھوک پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ جزئی تبدیلیاں اگر سلاج کے سیاسی ادارہ کو بدلے بغیر ممکن نہ ہوں تو سیاسی انقلاب کے لیے مواد تیار ہونے لگتا ہے۔ یا اگر یہ جزئی تبدیلیاں سماجی ہیئت کی نئی تماش خراش کے بغیر رونما نہ ہو سکیں تو سماجی انقلاب کے لیے زمین ہموار ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر سیاسی اور سماجی ہیئت کا کوئی مخصوص نقشہ تعمیر اصول تہذیب پر ضرب لگائے بغیر فروغ نہ پاسکتا ہو تو تہذیبی انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بہر حال انقلاب برپا کرنے والے اصول و نظریات کو تاریخی تصادم جاری رکھنے کے لیے جتنے زنگروٹ درکار ہوتے ہیں وہ ذہنی تنوع کی وساطت سے فراہم ہوتے ہیں۔

نظریات و خیالات کی جنگ | اب ہم اصل نقطہ بحث پر آگئے ہیں۔ یعنی یہ کہ نظریات و خیالات کی جنگ کس طرح ہوتی ہے۔ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اصول و نظریات کے اولاد و اصداد کی گروہ ہیں۔ (۱) فطری حقائق جن کی بنیاد پر ایک معتدل نظام تعمیر کیا جاسکے (۲) قیاسات جن کی بنیاد پر مختلف غیر متوازن نظام کھڑے کیے جاسکیں۔ اصل تصادم ان دو گروہوں میں ہے لیکن تصادم در تصادم کا میدان وسیع ہے کیونکہ خود دوسرا گروہ افکار پھر آگے دوڑے گروہوں میں بٹ جاتا ہے (۱) وہ افکار جن کا رجحان افراط کی طرف ہے (ب) وہ افکار جن کا رجحان تغریط کی طرف ہے۔ پھر ان دونوں انتہائی سروں کے درمیان بے شمار گروہ افکار ہو سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کی ضد ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے تمام گروہوں سے متصام دیکھیے شکل ذیل :-



ان میں سے مختلف اصول و نظریات کو سوسائٹیوں میں فروغ حاصل ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ علمبردار بل جاتے ہیں جو اگر انہیں ابھار نہ سکیں تو آئندہ نسلوں کی طرف کسی نہ کسی واسطے منتقل کر دیتے ہیں۔

فرض کیجیے "ج" خیال کے علمبرداروں کو ممکن حاصل ہو گیا ہے اور انہوں نے اپنے نظریات کی بنیاد پر ایک نظام نافذ کر رکھا ہے۔ اب "د" سے لے کر "ب" تک تمام گروہ اس نظام سے غیر مطمئن ہیں۔ ان غیر مطمئن گروہوں میں سے ہر گروہ مستقبل کے انقلاب کا علمبردار بننے کے قابل ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر نظریہ کے حامی ضرور میدان عمل میں آئیں اور جیسے گروہ میدان عمل میں آئیں، ضرور کامیاب ہو کر نکلیں۔ نہیں، ضروری اسباب کے فراہم ہو جانے سے چند قوتیں میدان میں نمودار ہوتی ہیں اور باقی سطح کے نیچے سانس روکے چند سالوں یا بعض اوقات صدیوں تک اچھے موقع کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ پھر جو گروہ سطح پر توجہ پیدا کرتے ہیں ان میں سے

سہ یا در ہے کہ اس ساری حرکت کے دوران میں مختلف گروہوں کے درمیان ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔

جو کوئی اسباب قوت پر قبضہ پالیتا ہے وہ دوسروں کو نکلتا جاتا ہے اور آخر کار اپنے اصولوں پر ایک نیا نظام زندگی قائم کر دیتا ہے۔ پھر اس کے خلاف قوانین فطرت کے تحت دوسری طاقتیں زور لگانے لگتی ہیں۔

اب ہمارا موضوع فکر یہ ہے کہ غالب ہونے والا گروہ افکار کس راستے سے گذر کر تمدن کی قیادت پر پہنچتا ہے اور اس راستے کے سنگھمائے میں کیا ہوتے ہیں؟

انقلاب کا راستہ | جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ہر انقلاب کی داستان انسان کے انفرادی ذہن سے شروع ہوتی ہے۔ چاہے اس انفرادی ذہن کو ایک خاص طرز فکر اجتماعی نظام کے موثرات ہی کے طفیل حاصل ہونا ہو۔ پھر فرد کی "خودی" ظہور چاہتی ہے اور اپنی تجلیات کو محدود یا وسیع طریقوں سے دوسروں پر منعکس کرتی رہتی ہے۔ ہر شخص اپنے نظریات کی حفاظت اور پرورش میں کچھ نہ کچھ کوشش صرف کرتا ہے۔ چاہے یہ کوشش زبان سے ہو یا قلم سے یا عمل سے۔ مگر بڑی شکل اسے یہ پیش آتی ہے کہ جب نظم اجتماعی بالکل جداگانہ اصولوں پر قائم ہو تو اس کے لیے اپنی عملی زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق تعمیر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مخالفانہ اجتماعی قضائیں اس کی خودی کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مجبور ہوتی ہے کہ حتی الامکان فضا کو بدسننے کی کوشش کرے۔ لیکن دوسری طرف نظم اجتماعی بغاوت برپا کر سکنے والے عناصر پر ہولت کار کے دروازے بالکل بند رکھتا ہے اور مسلح طاقتوں کا پیہرہ ان پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں موت اور ڈکھ اور ذلت کا پروانہ بیٹے ہوئے ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں مناصب کا فرمان اور روٹی ہوتی ہے۔ سچا مخالف عنصر صرف یہ کہ اپنے اصولوں کی خدمت نہیں کر سکتا بلکہ اس کو دشمن کے ہاتھ اپنی پوری قوتیں فروخت کرنی پڑتی ہیں۔ زبان پر قانون کی جہریں لگی ہوئی ہوتی ہیں اور قلمدانوں پر آرڈیننسوں کا سنگہ جاری ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں صرف وہ لوگ جرات مندانه سے کام لے سکتے ہیں جن کی خودی وراثتی اثرات، تعلیم و تربیت اور خارجی ماحول کے اثرات کی مدد سے بہت بختہ ہو چکی ہو۔ پھر چونکہ مادی قوت کے حصول کا راستہ تنظیم کی وادی سے ہو کر گذرنا ہے لہذا ایک تنظیمی قابلیت رکھنے والے لیڈر کا زمام کار کو ہاتھ میں لینے کے لیے سامنے آجانا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد کامیابی کا

انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ قوت کے سرچشموں پر کہاں تک قابو پایا جاتا ہے۔ گویا انقلاب کے لیے حسب ذیل برائیوں کو لازم ہیں:-

۱۔ جرأت کا رپید کرنے والے داخلی و خارجی عوامل جیتا ہونا۔

ب۔ افراد کے عدم اطمینان کو منظم بغاوت کی حد تک پہنچانے کے لیے ایک اچھے لیڈر کا فراہم ہونا۔

ج۔ قوت کے سرچشموں سے مناسب استفادہ۔

یہ سارے سامان بے یک وقت ہر مکتب خیال کے پیروں اور ہر اصول کے علمبرداروں کو حاصل

نہیں ہو جاتے اور جس کو حاصل ہو جاتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان نکات سے گناہ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

۱۔ ماحول | دبے ہوئے گروہ میں عموماً بزدلی، دون ہمتی، خود فروشی، جاہ پسندی، شکم پرستی اور احساس کہتری کے امراض خبیثہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے جو طاقت غالب ہوتی ہے وہ قانون، تعلیم، لٹریچر اور آرٹ کے ذریعہ سے ان امراض کے جراثیم کو مزید کمک پہنچاتی رہتی ہے۔ اس طرح محکوموں کا چارہ صرف نو میدی جاوید رہ جاتا ہے۔ لیکن قوانین فطرت ملتوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اس بد حالی میں امید کی شعاع نمودار ہوتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لٹریچر ماضی کی روایات کا تازہ خون سوسائٹی کی رگوں میں دوڑا دیتا ہے یا ہم عصر سوسائٹیوں کے کارنامے اچانک لوگوں کو مشتعل کر دیتے ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ غالب نظام کا تشدد لوگوں میں انتہا پسندانہ رجحان پیدا کر دیتا ہے، اس کے عیوب حد درجہ آشکارا ہو جاتے ہیں اور لوگ اس کے کمزور مورچوں کو دریافت کر لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اپنی جہلی اور راشتی اور کسی قدر اکتسابی قابلیتوں کے بل پر زیادہ جرأت کا رے کام لینے والے افراد نمودار ہونے لگتے ہیں اور نظام غالب و اس کے حریفوں میں کھلم کھلا تصادم شروع ہو جاتا ہے۔

بہر حال نظریات کے بیچ تاریخ کی کھیتی میں چاہے کتنی دیر پڑے رہیں، کبھی نہ کبھی پھوٹتے ہیں اور ان

کے سینوں سے انقلابات کے تناور درخت نمودار ہوتے ہیں۔ نتیجے اس وقت تک مٹی میں دبے رہتے ہیں اور اپنی قوت نمو کی حفاظت کرتے رہتے ہیں جب تک زمین نرم نہ ہو جائے اور وقت کی ریاست سے اس کی آبپاشی نہ ہو جائے۔ جہاں یہ دو تبدیلیاں رونما ہوئیں، انقلاب کی بسم اللہ ہو جاتی ہے۔

ب۔ لیڈر | اگرچہ ہر نظریہ، ہر اصول اور ہر خیال ابتداءً کسی فرد سے منسوب ہوتا ہے لیکن اس کا عملی نفاذ ایک اجتماعی منظم جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کو برسر عمل ہونے کے لیے ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جو کھڑے ہوئے افراد کو ایک مرکز پر مجتمع کر کے اس نصب العین کی طرف کھینچ لے جائے جو اصل داعیہ اجتماع ہو اور راستے کے حادثات کے خلاف زور لگانے کے لیے "قوت" فراہم کر سکے۔

فرد جب تک فرد ہوتا ہے، اس میں بغاوت اٹھانے کے لیے جرات زندانہ نہیں ہوتی لیکن کسی اجتماعی ہیئت کا پرزہ بن جانے کے بعد اس کا جوش کارمنزل شباب پڑ پھینچ جاتا ہے۔ اس لیے ہر انقلابی تحریک کو اعلیٰ درجہ کی داعی و عملی صلاحیتیں رکھنے والے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جب جن اتفاق سے مطلوبہ لیڈر اچانک اسٹیج پر آجاتا ہے تو اس کی دعوت پر ایک کتب خیال کے منتشر افراد جمع ہو جاتے ہیں تاکہ "راہ حق" کا روال فتنہ کا طریق عمل اختیار کیا جائے۔

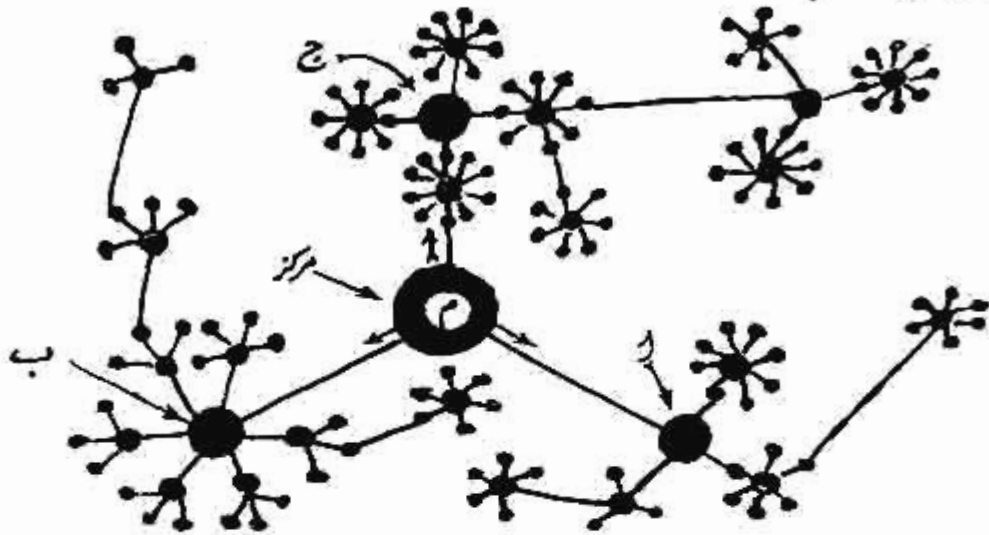
لیڈر کے ظہور کا وقت وہ ہوتا ہے جب ایک کتب خیال کے منتشر افراد میں اس کی پیاس بہ شدت محسوس کی جانے لگتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ لیڈر کی پیاس ہی لیڈر پیدا کرتی ہے۔ چاہے اس پیاس کے پیدا کرنے اور بھڑکانے کی ہم ہونے والے لیڈر ہی نے شروع کی ہو۔ اس پیاس کا احساس گروہوں میں نصب العین کی محبت کے غلبے سے شروع ہوتا ہے اور اس احساس کو خوب بھاپنا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی موت سے پہلے ہندوؤں کی ملت مسلمہ میں اس احساس کی نمود کا مطالعہ کر دیا تھا اور اسی مطالعہ کے نتیجے میں ایک دعائیہ قطعہ میں نئی قیادت کی پیشین گوئی کی تھی کہ :-

اگرچی آید آن "وانا کے راز سے" برہ اور الوائے دل گداز سے

(اردنجان مجاز)

ضمیر امتاں راجی کند پاک کلیمے یا حکیمے نے نواز سے

بہر حال منتشر افراد بڑی سے بڑی کوشش کریں تو بھی اپنے نظریات کے تحفظ میں مدافعت حرکت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن جماعتی تنظیم کے ذریعے جارحانہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ جارحانہ کارروائی ہی کے لیے تاریخ میں منظم جماعتیں رونما ہوتی ہیں اور یہی مسائن سے فضا میں اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیتی ہیں۔ جماعتی خیریت کا اندازہ ذیل کی شکل سے ہو سکے گا:-



دیکھیے ایک جماعت کا مرکز م کس طرح ایک مرکزی پاور ہاؤس کی طرح ل، ب اور ج تبعی مرکز کو قوت بہم پہنچاتا ہے اور پھر یہ تبعی مراکز اپنے گرد مزید تبع تابعین فراہم کرتے اور انھیں قوت کا مرکز بناتے جاتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ سوسائٹی کے اندر خاص نوعیت کے خیالات کا ایک غیر مرئی جالاساتن جاتا ہے جس میں فرد فرد جکڑا جاتا ہے۔ اس جالے کا سا حرازہ اثر خزانوں، مصنفوں، مقررین، اور ماہرین فنون کے دماغوں میں سرایت کر جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ساری سوسائٹی پر چھا جاتا ہے۔ غلط اصول ہوں یا صحیح اصول، الہامی نظریات ہوں یا فلسفیانہ قیاسات، خدا پرستی ہو یا مادہ پرستی جس کو بھی نظام زندگی کی اساس بننا ہو اس کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔

قوت کی فراہمی | جماعتوں کی قوت کے اسرار مرتبہ تین ہیں۔ (۱) تعدادی اکثریت یعنی کوئی جماعت آباہی کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنے اصولوں کا قائل اور اپنے نصب العین کا شیدائی بنا کر اپنے اندر جذبہ کے

(۲) کیرکٹر یعنی جمع شدہ افراد کی سیرت کو نصب العین اور پروگرام کی ضروریات کے مطابق خاص سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ (۳) رائے عامہ کی حمایت۔ یعنی عوام کے اس گروہ کو جو سربراہ کاری کی اہلیت نہیں رکھتا، اخلاقی طور پر اپنا معاون بنایا جائے۔ اس غرض کے لیے جو گروہ وسائل مروجہ کو زیادہ بہتر طریقہ پر استعمال کرنے کا وہ غالب ہونے لگے گا۔ موجودہ نظام تمدن کے ماتحت تخریبیں عموماً حسب ذیل وسائل کے بل پر آگے بڑھتی ہیں۔

۱۔ پہلا وسیلہ قوت پریس پر قبضہ کرنا ہے۔ اخبارات و رسائل جو موجودہ دور میں ذہنی انقلاب کا قوی ترین وسیلہ ہیں ان میں سراسر ایسے کیسے بغیر کوئی بڑا انقلاب نمودار نہیں ہو سکتا۔ صرف اسی ذریعہ سے دنیا کی سیاسی اور سماجی حالت پر ایک نئے زاویے سے نظر ڈالنا عوام کو سکھا جا سکتا ہے اور تخریبی تنقید سے راجح الوقت تہذیب یا سماج یا سیاست کے خلاف بے اطمینانی پھیلائی جا سکتی ہے اور نئے نئے مقاصد کی طرف ذہنی رہبری کی جا سکتی ہے۔

۲۔ تعلیم۔ غالب نظام تو تعلیم کا ایسا انصاب نافذ کرتا ہے جو قبل اطفال کا ہم معنی ہو۔ وہ تو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اپنی ضرورت کے پڑے ڈھلواتا ہے لہذا انقلابی جماعتوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیمانے پر مروجہ نظام تعلیم کے متوازی اپنا نظام تعلیم قائم کریں اور اس طرح نئی نسلوں کی ذہنیت کی تعمیر اپنی ضروریات کے مطابق کریں کہ انقلابی جنگ کے لیے سپاہی بھی پیدا ہونے لگیں اور مستقبل میں نئے نظام کی مشین کو چلانے کے لیے ڈرامیوروں کا قحط نہ حاصل ہو۔

۳۔ جدید اختیار کردہ نظریات کی بنیاد پر لٹریچر کی تیاری۔ آج کل تعلیم کا دائرہ مدرسہ کی چار دیواری سے باہر دوڑ تک پھیل گیا ہے تعلیم یافتہ آدمی ساری عمر طالب علم بنا رہتا ہے کیونکہ زندگی کے مسائل بے شمار ہیں اور ان کے صحیح حل کی خواہش ذوق تحقیق اور ذوق مطالعہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارے علم کی ہر شاخ اتنی وسعت اختیار کر چکی ہے کہ آج یونیورسٹیوں میں "اسپیشلسٹ" پیدا کرنے پر مجبور ہیں اور ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنی علمی دلچسپیوں کو کسی

ایک شاخ پر مرکوز کر دیتا ہے لہذا ضروری ہے کہ ایک انقلابی تحریک اپنے نظریات کو علم کی ہر شاخ میں حل کر دے۔ وہ طبیعیات، نفسیات، اخلاق، علم السیاست، علم المعیشت، علم الاجتماع وغیرہ علوم میں سے ہر ایک کی روشنی میں اپنے اصولوں کا برحق اور مفید ہونا مبرہن کر دے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ شاعری، افسانہ اور ڈرامہ میں بھی انقلابی نظریے کا سمو یا جانا ضروری ہے تاکہ جو لوگ تنگ تنگ ذہن ہیں رکھتے یا فکر کے لیے فرصت سے محروم ہیں اور محض تغیر بھی مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے ذہن میں بھی نفوذ حاصل کیا جائے۔ اس علمی امامت کے بغیر دماغوں کو فوج کرنا ممکن نہیں۔

۴۔ اسٹیج پر قبضہ۔ یہ ایک آخری سائیکل میل ہے۔ تقریر کا اثر بہت تیز اور وسیع ہوتا ہے۔ صحافت، تعلیم اور لٹریچر تو باروت بچھانے کا کام کرتے ہیں اور خطابت اس کو فیتلہ دکھاتی ہے لیکن اس کام میں بڑی ہشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر فیتلہ وقت سے پہلے دکھا دیا جائے تو بنا بنا یا کام بگڑ جاتا ہے۔

اسٹیج سے انقلاب کی دعوت کو اس وقت بلند ہونا چاہیے جب "قیادت" کو ایک طرف سے تو یہ ٹھہران ہو کہ عوام کی بے پناہ طاقت کو قابو میں رکھنے کے لیے سربراہ کاروں کا ایک قابل اعتماد گروہ موجود ہے اور دوسری طرف یہ محسوس ہو کہ ملک کی سیاسی فضا اور خارجی طاقتوں کے حالات تصادم کے لیے موافق ہو چکے ہیں۔ ان سارے ذرائع سے ایک انقلابی جماعت لوگوں کو ایک طرف مروجہ نظام کے خلاف سخت تنقید کر کے

غیر مطمئن اور غیر مطمئن سے آمادہ بغاوت کرتی رہتی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے پسندیدہ اصول و نظریات کے برحق ہونے پر تعمیری افکار پیش کر کے لوگوں کو اپنا حامی بناتی ہے۔ اسے عوام کو اس یقین کی حد پر پہنچانا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کرتا چاہتے ہیں وہ تمہارے لیے سراسر فائدہ پر مبنی ہے۔ اس تبلیغ افکار سے، پہلے قریب ترین لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر ذرا دور کے لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر اثر کا حلقہ مزید وسیع ہونا جاتا ہے اور وہ مخالف عناصر بھی جماعت میں جذبہ ہونے لگتے ہیں۔ جو شبہات، قدامت پسندی، غلط فہمی، دیانت دارانہ اختلاف یا تعصب کی وجہ سے دور رکھنے تھے۔ حتیٰ کہ وہ آبادی جو آخر دم تک مخالفت کرتی ہے وہ بھی انقلاب کی رو کے بڑھ نکلنے کی صورت میں بے صلہ

دیا یوں ہو کر سر جھکا دیتی ہے۔

تبلیغ افکار میں جان پڑتی ہے عمل سے۔ اگر عمل اور دعوت میں تضاد ہو گا اور تحریک کے داعیوں کی سیرت ان کی عموماً مطابقت نہ ہوگی تو تحریک فیل ہو جائے گی۔ اور اس کا چلن اسی وقت تک کے گا جب تک ہاتھی کے دکھانے کے دانت فریب دینے کے قابل رہیں گے۔ الغرض جب انسانوں کی ایک کثیر تعداد کسی نظام پر مضامین نہیں رہتی تو اس کا چلنا محال ہو جاتا ہے چاہے وہ کیسی ہی عظیم الشان مادی قوتوں سے کیوں نہ مسلح ہو۔ نظام غالب اور اس کے حریف کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔ نظام غالب ساری جنگ مادی قوت کے بل پر لڑتا ہے وہ سنگین اور روٹی کی مدد سے بازی جیتنے کی فکر کرتا ہے۔ بغلات اس کے انقلابی تحریک خلافتی قوت کے بل پر آگے بڑھتی ہے اور غیر متنزل قوت ایرانی، اصول پرستی، ایشیا و قریبائی اور خدمت انسانیت کے مظاہرہ سے عوام پر سکھ جاتی ہے۔ عوام سے اس کا رابطہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ عوام کی ہمدردیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ نظام غالب مجبور ہوتا ہے کہ انہیں عوام میں سے ضروری کارندے حاصل کرے۔ ان کارندوں کے پیٹ تو حکومت کے بس میں ہوتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ پر انقلابی تحریک کا قبضہ مہیا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک نظام کے انجن بااصل اپنے دشمنوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ یہی وہی جو کسر ہوتی ہے وہ اندرونی فوجی بغاوت یا کسی بیرونی حملہ کی مدد سے پوری ہو جاتی ہے اور تاریخ میں اس کے لیے بار بار مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

انقلابات کی اقسام | انقلابات کا دائرہ جتنا محدود ہوتا ہے، اتنی ہی کم جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس دائرہ میں جتنی وسعت ہوگی، جدوجہد بھی اتنی ہی سخت کرتی پڑے گی۔ انقلابات عالم کو اگر اس لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو تین بڑے عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جاسکتا ہے :-

۱۔ حکومتی انقلابات۔

ب۔ سماجی انقلابات۔

ج۔ تہذیبی انقلابات۔

محض حکومتی انقلابات کے داعی مروجہ اصول تہذیب اور سماج کی اساسی ہیئت سے تو مطمئن ہوتے ہیں لیکن بعض جزئی تغیرات کی خواہش کو جو حالات وقت کے ماتحت بھڑک اٹھتی ہے، سیاسی ہیئت برسر عمل نہیں آنے دیتی تو لوگوں کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سیاسی ہیئت کو بہ حیرتور کر ایک نئی سیاسی ہیئت قائم کر لیں۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ سیاسی ہیئت کے بدل جانے سے سماجی ہیئت میں رفتہ رفتہ بہت بڑے تغیرات واقع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصول تہذیب پر اثر چاڑھتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے تاریخ میں بے شمار انقلابات کی داستانیں محفوظ ہیں۔ قریب ترین دور میں سے آپ جرمنی کے انقلاب کو سامنے رکھ لیجئے۔ تازی پارٹی دراصل اس لیے وجود میں نہیں آئی تھی کہ اسے سماجی ہیئت کو توڑنا ہے بلکہ "جمہوریت" کی پالیسی کو ملک کے لیے مفید سمجھی تھی اور اس پالیسی کو ختم کرنے کے لیے اس نے مروجہ سیاسی ہیئت کو توڑ ڈالا۔ یہ الگ بات ہے کہ نئی سیاسی ہیئت کے پیٹھ سے خود بخود سماج کا ایک نیا ڈھانچہ برآمد ہوتا گیا۔

رہے سماجی انقلابات، تو ان کے علمبرداروں کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نظام زندگی میں کچھ مرکزی تبدیلیاں کی جائیں لیکن یہ لوگ مروجہ اساس تہذیب سے متفق ہوتے ہیں تاہم ان کے لیے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ حکومت کے اس نظام پر حملہ آور ہوں جو مروجہ نظام زندگی کے متعصبانہ تحفظ کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اس کی مثال انقلاب روس ہے۔ اشتراکیت، الحاد، زندگی بعد موت سے انکار، انسان کے حیوانی تصور حیات اور زندگی برائے زندگی وغیرہ اکثر مروجہ تہذیب میں پائیدار یورپ بالکل متفق ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ فرد اور سوئٹزرلینڈ کی حدود عمل میں یورپ اختلاف کرتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ان غیر سوئٹزرلینڈی کامنٹی نظام اس نقشہ پر کھڑی نہیں کیا جاسکتا جو اشتراکیت مرتب کی ہے پھر پھر لراہ جمہور لیکر امریت تک اور امریت سے لے کر مزدوروں کی خداوندی تک ایک ہی دور تہذیب کا سکہ رواں ہے۔ یہ سارے انقلاب اور تغیر اندرونی ہیں اور ابھی تک ان امریت کو ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل کرنے والا انقلاب رونما نہیں ہوا ہے۔

بخلاف مذکورہ صدر دونوں قسم کے انقلابات کے تہذیبی انقلاب نظام حیات کو جڑ سے لے کر پتلا

تک بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ نہ مروجہ اصول تہذیب کے راضی ہوتا ہے، نہ سماج کے خارجی ڈھانچہ سے اتفاق کرتا ہے اور نہ نظام سیاسی سے مطمئن ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے انقلاب کی مثال عرب کا اسلامی انقلاب ہے۔

ان سب میں سے اول الذکر سہل ترین اور آخر الذکر مشکل ترین ہے۔ اول الذکر کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ کسی اندرونی فوجی بغاوت یا کسی خارجی طاقت کی امداد سے ضروری تغیر برپا کر لے لیکن ثانی الذکر اور ثالث الذکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی کو پہلے اپنے پروگرام سے متفق کر لے ورنہ حکومت پر قبضہ پانینے کے بعد بھی اصل مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ پھر ان دونوں میں سے پہلے انقلاب کی توجیہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک قومی پارٹی سیاسی غلبہ پا کر یہ جبر لوگوں پر ایک سماجی ہیئت کا نفاذ کر دے جیسا کہ روس میں عملاً ہوا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی انقلاب کے خلاف تھی لیکن ایک فعال جمیعت نے جب قوت کے سرخیوں پر قابو پایا اور خون کے سیلاب بہا کر اپنا سکہ جما لیا تو لوگوں کے لیے یہ انقلاب جھکا دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ لیکن دوسرا انقلاب جبر کی راہ سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ کوئی مخصوص اصول تہذیب بہ جبر دماغوں میں نہیں اُتتا سہ جا سکتے۔ تہذیبی انقلاب کا بیج تو صحن "روح" میں بویا جاتا ہے، پھر وہ ایک وقت لے کر پھوٹتا ہے، پھر رفتہ رفتہ آخر میں کلمہ طیبہ "ہو یا کلمہ خبیثہ" برگ و بار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثالث الذکر انقلاب کو بہت بڑی فراہمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے اسے بہت زیادہ قوت فراہم کرنی پڑتی ہے۔

میدانِ مقابلہ کی وسعت | انقلاب کی نوعیت کے علاوہ میدانِ مقابلہ کی وسعت بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو قوت کی ضرورت کو گھٹاتی بڑھاتی ہے: ہمارے عالم نظریات کے میدانہائے مقابلہ کے لحاظ سے تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

۱۔ قبائلی دور - ۲۔ قومی دور - ۳۔ بین الاقوامی دور۔

قبائلی دور میں اجتماعی انقلاب بالکل غیر محسوس ہوتا تھا، اتنا غیر محسوس کہ ہم بین الاقوامی دور کے لوگ اس پر اجتماعی انقلاب کے الفاظ کا اطلاق موزوں نہیں سمجھتے۔ قبائلی دور کے تنگ سے میدانِ عمل میں نظریات کی کشمکش، ماحصل چھوٹی چھوٹی قوتوں کے بل پر جاری رہتی تھی اور تاریخ کے پہیے کا محیط بہت چھوٹا تھا اس لیے آڈل بدل تیزی سے

ہوتا تھا اور دو انقلابات کے درمیان امن و سکون کی مدت بہت مختصر ہوتی تھی۔ اس دور میں کسی نظریے کا معیار خیر و شرقیہ کی بنیاد پر تھا۔

پھر قومی دور آیا اور فیصلے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر اقوام کی شکل اختیار کر گئے۔ اور جہاں پہلے افراد کے درمیان کھینچا تانی ہوتی تھی وہاں اب بڑی بڑی پارٹیوں کے درمیان تاریخی کشمکش شروع ہو گئی۔ اب نظریات کی پرکھ قبیلوں کے نقطہ نظر کی بجائے قومی مفاد کے نقطہ نظر سے ہونے لگی۔ تاریخ کے چکر کا محیط پھیل گیا۔ انقلابات کا دریا وقت و اسباب تمدن نے بڑھا دیا اور انقلابی تحریکیں بہت زیادہ قوت کی محتاج ہو گئیں۔

لیکن آج ایجادات و اختراعات اور تمدن کی ترقی نے قوموں اور ملکوں اور لوگوں کے درمیان دیواریں ہٹا دی ہیں۔ نظریات کی کشمکش کا میدان اب عالمگیر ہے۔ پوری نوع انسانی ملت احمدہ کی شکل میں تحلیل ہو رہی ہے۔ اس نئے راج نظریات کی پرکھ قومی مفاد کی کسوٹی کی بجائے انسانیت کے مجموعی مفاد کی کسوٹی پر ہو رہی ہے اور قومی مفاد کے پرستار بھی مجبور ہیں کہ انسانی کا نام لے کر میدان میں آئیں اور عالمگیر اصلاح کا جھنڈا بلند کریں۔ اب میدان عالمگیر جماعتوں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔ بڑے بڑے منظم گروہ جدید رائج سے دیکرے گروہوں میں نفوذ کر رہے ہیں۔ آج جو گروہ بھی کوئی آواز بلند کرتا ہے اسے دینا بھر کے نظاموں پر تنقید کرنی پڑتی ہے، اسے اپنے مجوزہ نظام کے حق میں پبلک کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ثابت کرنا پڑتا ہے کہ یہ نظام فی الواقع انسانی زندگی کے لیے بہترین ہے۔ لہذا اس دور میں کسی انقلاب کی علمبرداری کے لیے بڑی وسیع طاقت درکار ہے۔

خود ہندوستان کو دیکھیے۔ یہاں انگلینڈ کی سربراہی دارانہ جمہوریت، جرمنی کی آمریت اور روس کا سولزم در کشی میں مصروف ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں اسلامی انقلاب کے داعی بھی اٹھیں تو انہیں حکومت متسلطہ پر چھٹنے سے پہلے ان سارے نظریات کی قوت کے متصادم ہونا پڑے گا۔ پھر انقلابی عناصر تو سیاسی ملیاجی ہیئت کو بدل دینے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن اسلام اصولی تہذیب سماجی ہیئت اور سیاسی ادارہ سب بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ تو پوری عمارت کو گرا کر ایک نئے نقشہ پر تعمیر کرنے والا ہے تاکہ موجودہ تاریک دور تہذیب کے یہ خون خرابے، بارود معالو، یہ ہاتھ پائیاں ختم ہوں اور ایک نئے روشن دور تہذیب نمودار ہو جس میں انسان امن، آزادی اور اطمینان کا سانس لے سکے۔

اس دور میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی مفاد کے لیے لوگوں کو اپیل کرے تو آپ اسے حق سمجھتے ہیں، لیکن آپ خود انسانی مفاد کے بجائے قومی مفاد کا جھنڈا بلند کر کے ہی حماقت کر رہے ہیں۔ "آزاد ہندوستان" سے صرف ہندوستانیوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ "رام راج" صرف ہندوؤں کو اپیل کر سکتا ہے۔ "پاکستان" کا نعرہ صرف مسلمانوں کے دماغوں پر فتح پاسکتا ہے لیکن دنیا کو مخاطب کرنے کے لیے ایک "امت وسط" کی ضرورت ہے۔ یہ منصب خالی پڑا ہے۔ اور اس طاقت کے لیے خالی ہے جو بڑھ کر اس پر قبضہ کرے۔

"جو بڑھ کر خود اٹھائے ہاتھ میں مینا سی کا بڑ"

یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک نئی تہذیبی امرت "کاسر چشمہ اٹنے لگے اور ایک نئی روح عصر" نمودار ہو جو دنیا کی ذہنی فضا میں سرایت کر جائے اور اس میں ہر سانس لینے والا اسی طرح متاثر ہو کر رہ جائے جس طرح آج تک یورپ کی "عادی روح عصر" سے کرہ ارضی پر بسنے والا ہر شخص کم و بیش متاثر ہوتا رہا ہے موجودہ تاریک دور تہذیب پر "درد زہ" کے جو دورے پڑ رہے ہیں یہ اپنی واضح علامات سے ایک مردہ بچے کے برآمد ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور گمان غالب یہی ہے کہ "یہ ہونہار بچہ" اپنے ساتھ ماں کو بھی لے ڈوبے گا۔ تاریکی کی نسل کے اس انقطاع سے ایک نئے دور تہذیب کے ظہور کا راستہ کھل جائے گا۔ لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ زندگی کے پاکیزہ اصولوں کو جانیں لڑانے والے بے لوث سپاہی ہاتھ آتے ہیں یا نہیں، ہونہار شمر کی قوت "ابلیس کے تعویذ" سے پھیل سکتی ہے یا کم از کم تاریخ کے دو دوروں کے درمیان ایک ایسا "ٹھیکر" حاصل ہو سکتا ہے جو ہونے والے واقعات کو ملتوی کر دے اور کام کرنے والی متضاد قوتوں میں ایک بہترین موقع

۱۹۵۰ ہندوؤں کی بری سیاسی طاقت اس لائن پر کام کرنا چاہتی ہے کہ پہلے قوم کو اپیل کر کے حکومت کی شینری پر قبضہ کیا جائے اور پھر کوئی وسیع ترین گرام سامنے نکالا جائے۔ حالانکہ ایک وسیع تر پروگرام پر بھی قوم اور قوم سے باہر کے لوگوں کو اپیل کیا جا سکتا ہے اور ایک جھانگیر پروگرام کے نام سے بھی حکومت کی کل پر قبضہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اصل قوت عاملہ تو عوام کا ایک نصب العین پر دل و جان سے متحد ہو جانا ہے چاہے یہ نصب العین قومی ہو یا انسانی۔

گنوا دیں۔ یہ وقت عمل میں تاریخ کو آگے دھکیلنے کا ہے۔ جو اگر یہ بھی یہ خدمت سرانجام دے گا تاریخ سازی کے منصب پر وہی فائز ہو جائے گا۔

بہر حال زندگی کی پیکار گاموں میں جو شخص اتار دیا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب کا خود یقین کرے وہ سچ لے کہ مختلف نظریات میں سے وہ کس کے لشکر کا سپاہی یا سپہ سالار بن سکتا ہے یا کیا اسے محض تماشا بن کے رہنا پسند ہے؟ یہ زندگی کی پونجی کدھر صرف کی جاتی ہے؟

از عدم سوئے وجود آئی؟ میا	دوسرے بہت وجود آئی؟ میا
در تلاشِ خرمنے آوارہ شو	در بیابانی چوں شرار از خود مرو
پابند در وسعت آباد سپہر	تاب و تب داری اگر مانند مہر
ماہیاں را در تہ دریا بسوز	کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز
در جہاں شاہین بنی، شاہان بیکر	سینہ داری اگر در خورد تیر

طیلاع

اجباز زمزم "لاہور جو حکومت کی بعض پابندیوں کی بنا پر بند ہو گیا تھا، اب پھر جاری ہو گیا ہے"

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ، جو مسئلہ جبر و قدر کی تحقیق پر ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں، اب پہلی مرتبہ کتابی شکل میں طبع ہو کر آ گیا ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرمائیں

منیجر مکتبہ ترجمان القرآن، دارالاسلام جمال پور ضلع گورداسپور